مفتی محمد عبدہ مصری کے دینی تجدیدی افکار کا تحقیقی جائزہ

حافظ محمد ارشد اقبال
لیکچرر، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، مظفر گڑھ
حافظ عقیل احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، خانیوال

Abstract

According to Mufti Abduh, Islam does not believe in the slavish imitation of traditions rather it emphasizes the use of intelligence, seeking knowledge and the expression of thought. This was the reason that made his followers called him a sage, a reviewer of religion and a reforming leader.Abduh positively held close to the ideas of modernity which principally geared to the progression of Muslim society. As far as Islam is concerned, his ideology was largely stranded in rationalism, liberalism, nationalism and universalism. The practice of Islam is essentially rooted in ontological ground of rational and logical truth and its teaching is patent and clear for common understanding and conception. He molded essential framework for restructuring and reforming which heralded for change and supporting a more modern conception of Islam that consequently believed in to enlighten cherished classical Islamic traditions and ideas. The struggle represents Mufti Abduh's stand for revival of Islamic principles in contemporary society, and renaissance of Islam in political the growth of free will and the scenario. **Keywords:** Traditionalism, Liberalism, Mufti Abduh

جب تک اسلام اپنی عملی شکل میں موجود رہا اس وقت تک عالم اسلام امن و آشتی کا گہوارہ بنا رہا یہی وجہ ہے کہ پہلی چار صدیوں میں عالم اسلام نے اخلاقی، علمی اور تمدنی لحاظ سے حیرت انگیز ترقی کر کے سارے جہان کی سیادت حاصل کر لی تھی۔ جنگ و امن ہر دو حالتوں میں اس کا سکہ چلتا رہا۔ مسلمانوں نے فارس، یونان اور روم کے تمام علوم پر دسترس حاصل کر لی تھی۔ ان علوم کے امتزاج اور آمیزش سے ایک نئی تہذیب کی بنیاد پڑی، جس کے رنگارنگ مظاہر بغداد، دمشق، قاہرہ اور قرطبہ تھے۔ اس ترقی کے بعد تنزل کے اسباب بھی پیدا ہونے لگے۔ عالم اسلام کو ایسے حوادث سے دوچار ہونا پڑا جن سے تنزل رکنے کی بجائے بڑھتا چلا گیا۔ عالم اسلام نے ہر ممکن طریقہ سے مقابلہ کی کوشش کی۔ عالمِ کفر کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے اپنے جان و مال اور علم و فن کی بازی لگا دی۔ ساتویں صدی ہجری میں منگولوں نے ظالم و جابر چنگیز خان اور اس کے خلیفہ ہلاکو خان کی سرکردگی میں عالم اسلام کے بڑے حصہ کو زیر وزبر کر دیا۔ بغداد جس سے سارے جہان کی رونق و زینت قائم تھی، بے دردی سے لوٹا گیا۔ اس تباہ حالی کا نشانہ صرف بغداد ہی نہ بنا بلکہ سارا عالم اسلام اس تباہی و بربادی سے دوچار ہوا۔ ایک خدائی قہر تھا جو کفار کی صورت میں مسلمانوں پر نازل ہو رہا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا عالم اسلام جہالت، ظلم اور افلاس کے گڑھے میں گرتا گیا، اگرچہ وقفے وقفے سے مصلحین کی آمد ہوتی رہی اور نشاۃ ثانیہ کی صورتیں چہرہ دکھاتی رہیں تاہم عالم اسلام کے غلبے کی پہلے والی صورت پیدا نہ ہو سکی اور مجموعی طور پر عالم اسلام تنزل کی طرف ہی بڑھتا رہا۔

انیسویں صدی کا نصف آخر عالم اسلام کا انتہائی تنزلی کا دور تھا۔ جب یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار و تبلیغ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نتیجتاً مسلمانوں کی فکری و علمی صلاحیتوں کو زنگ لگنا شروع ہو گیا اور تمام عالم اسلام کہیں جزوی اور کہیں کلی طور پر مغرب کا محکوم بن گیا۔ اسی زمانہ میں اسلامی حکومتوں کے اقتدار و تسلط کو اتنا سخت دھچکا لگا کہ یا تو وہ بالکل ناپید ہو گئیں اور اگر باقی بھی رہیں تو مغربی استعماریت کے استیلاء نے انہیں بالکل بے دست و پا کر دیا۔

خداوندی انتظامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس دور میں کتاب و سنت کی جس قسم کی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کے دلوں میں اس کا داعیہ پیدا کر کے ان کو اس طرف متوجہ فرما دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام کا دامن ایسی شخصیات اور افراد سے بھرا ہوا ہے جنہوں نے ہر دور میں مسلمانوں کے لیے علمی اور فکری راہنمائی مہیا کی۔ اس کی زندہ جاوید مثال انیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کی خستہ حالت کو دیکھ کر ان کے احیاء کے غرض سے بعض ایسی علمی و عملی شخصیتیں منظر عام پر آئیں جنہوں نے مسلمانوں میں قومی عزت و خودداری کا احساس پھر جگانا چاہا اور بے شمار مخالفتوں کے باوجود اپنے نصب العین کی تکمیل میں ثابت قدمی کے ساتھ سرگرمِ عمل رہے۔ ہندوستان میں سرسید احمد خان، مصر میں مفتی محمد عبدہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے ان قوتوں اور اجتماعی محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی جو زمانہ جدید کی تشکیل میں حصہ لے رہے تھے اور مغربی تمدن کے استیلاء کا باعث بنے ہوئے تھے۔

محمد عبدہ اور سرسید احمد خان کی زندگی میں ایک عجیب وغریب مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم کی اصلاح و اشاعت میں صرف ہوا۔ محمد عبدہ نے جامعہ ازہر کے طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کی اصلاح پر اپنی مساعی مرکوز کیں۔ سرسید

احمد خان نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ دونوں نے اپنی اپنی زبانوں میں ایک ادبی انقلاب کی ابتدا کی۔

سرسید احمد خان کے مقابلے میں مفتی محمد عبدہ نے مسلمانوں میں مذہبی جمود کو ختم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ وہ اسلام کے بنیادی عقائد کی مکمل حفاظت کے ساتھ دیگر بنیادی امور میں ترقی وتجدید کے داعی تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ مسلمانانِ عالم جب تک اوہام پرستی، ضعیف الاعتقادی جہالت اور جمود وخمود کے بندھنوں سے آزاد نہ ہوں گے نہ ان کا دین پوری آب وتاب سے جلوہ گر ہوگا اور نہ وہ سیاسی، معاشرتی اور دوسرے دنیاوی امور میں زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ چلنے کے قابل ہوں گے۔

اسی لیے اُن کے اصلاحی پروگرام اور تجدیدی فکر کا تقاضہ یہ تھا کہ اسلام کو اس کی دیرینہ سادگی اور اثر آفرینی کی طرف لوٹایا جائے اور دوسری طرف عام مسلمانوں کو خالص اور حقیقی دین کو قبول کرنے اور انہیں خلوص کے ساتھ اسلامی احکام کے اتباع کرنے کیلیے آمادہ کرنا تھا۔ عبدہ کا یہ اصلاحی پروگرام ایک طرح سے نئے انداز اور نئے معنی میں اسلام کا احیا تھا تاکہ مسلمانوں کو ان کی زبوں حالی سے نجات دلائی جاسکے اور ان کو اُن کے دیرینہ شرف ومقام کی طرف لوٹایا جاسکے۔

امام موصوفؒ کی فکر کا دائرہ کسی ایک موضوع کے گرد نہیں گھومتا تھا بلکہ ان کے افکار دین، معاشرہ، معیشت اور سیاست وغیرہ کو محیط تھے اپنے تجدیدی افکار ونظریات کا اظہار مذکورہ موضوعات پر کیا ہے۔

امام موصوفؒ کے حالات کا احاطہ ان کی دینی اصلاح کی فکر پر روشنی ڈالے بغیر ممکن نہیں کیونکہ امام موصوفؒ اسی میدان کے شہسوار ہیں اور اسی میں ان کے جوہر نکھر کر سامنے آتے ہیں اسی سے ہم ان کے حالات سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہئے کہ دوسرے مقاصد سے واقفیت دینی اصلاح پر ان کی فکر کی محتاج ہے۔

امام موصوفؒ کی دینی اصلاح کے حوالے سے چند باتیں پیش نظر رہی ہیں۔ دینی تجدیدی افکار میں بنیادی طور پر امام موصوفؒ مقام عقل کو واضح کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دین کی تفہیم کے لیے عقل کو تقلید کی قید سے آزاد کرنے کو ضروری قرار دیا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دین کو اسلاف امت کے طریقے پر سمجھنا ضروری ہے جب تک دین اسلافِ امت کے طریقے پر چلتا رہا، اختلافات کے چنگل سے آزاد رہا۔(۱)

امام موصوف فرماتے ہیں اگر ہم عقل جس کو اللہ تعالیٰ نے اختلاف ختم کرنے کے لیے معیار بنایا ہے۔ اگر ہم اس کا اعتبار کریں گے تو تخلیق عالم انسان کی حکمت مکمل ہوجائے گی اور اس صورت میں عقل علم دوست، اسرار کائنات پر گفتگو کرنے والی، ثابت شدہ حقائق کے احترام کی داعی، تادیب نفس اور اصلاح عمل میں ان پر اعتماد کی باعث ہوگی اور یہ تمام باتیں تب ہیں جب ہم عقل کو معیار مقرر کرلیں۔ لیکن یہ آسان نہیں بہت مشکل ہے عقل کو معیار قرار دینا پوری امت کو مخالف بنالینے کے مترادف ہے۔

جیسا امام موصوفؒ نے میں فرمایا ہے:

''میں نے اس دعوت میں دو بڑے گروہوں کی رائے کی مخالفت کی ہے جن سے ترکیب امت ہے۔ علم دین کے طلبہ اور ان کے پیروکار اور جدید فنون کے طلبہ اور ان کے ہمنوا''(۲)

اس مشکل مقصد کو لے کر ان دونوں گروہوں کو چیلنج کرنا جنہوں نے امت مسلمہ کو دام فریب میں قید کر رکھا ہے۔ ان میں

سے ایک گروہ علم دین کے طلبہ پر مشتمل ہے۔ جو تاریک عثمانی دور کی پیداوار فکر کو مقید کرنے والے، زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کی طرح غیر متبدل افراد ہیں۔ دوسرا گروہ مغرب سے مرعوب لادین افراد پر مشتمل ہے۔

ان دونوں گروہوں کے افکار کے خلاف اس مشکل مقصد کو لے کر کھڑا ہونا مفتی محمد عبدہ کا جہاد تھا۔ یہ جہاد جدید موقف، تیسرے راستے اور ایسے دین کی ترویج اور اشاعت کے لیے تھا جو ان دو گروہوں کے بین بین ہے۔

بڑے غور و فکر کے بعد امام موصوفؒ نے تجدید دین کے بارے یہ موقف اپنا لیا کہ اس امت کی بیداری کا راستہ دینی تحریک کے سوا کوئی نہیں، اور تحریک دین دینی اداروں کی اصلاح کے ساتھ ہی ممکن ہے اس کے بغیر ممکن نہیں۔ جب دینی اداروں کی اصلاح ہو جائے گی تو خود بخود امت میں بیداری کی لہر دوڑ جائے گی۔

اس سلسلے میں سب سے اہم ادارہ جامعہ ازھر کا تھا۔ ان کے نزدیک دینی اداروں میں سب سے پہلے اصلاحات ازھر کی ہونا ضروری تھی۔ یہاں تک کہ جب آپؒ جامعہ ازھر کی اصلاح سے مایوس ہو رہے تھے تو آپؒ نے اپنی تجدید دین کی امیدوں کو ''دار العلوم'' جو جامعہ ازھر کے مقابلہ میں علوم دنیا وعلوم دین کو یکجا کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا سے منسلک کر لیا تھا۔ یہ ''دار العلوم'' علوم دین اور علوم جدیدہ سے مزین تھا۔

امام موصوفؒ ایک عرصہ جامعہ ازھر کی انتظامی مجلس کے رکن بھی رہے۔ جامعہ ازھر سے منسلک ہونے کے دوران امام موصوفؒ نے کئی معرکے سر کئے۔ ان معرکوں کا صرف اور صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ جامعہ کے طریق تعلیم میں تبدیلی لائی جائے۔ چنانچہ انہوں نے عرصہ دراز تک جامعہ کے طلباء کو جغرافیہ پڑھایا۔ مفتی عبدہ کے معاصرین جغرافیہ اور اس طرح کے دوسرے معاشرتی علوم کو دین سے باہر سمجھتے ہوئے بدعت سمجھتے تھے۔ ان علماء کے نزدیک معاشرتی علوم پڑھانے سے طلباء کی زندگیوں میں گمراہی عقبی راستے سے داخل ہو جائے گی اور وہ بے دین ہو جائیں گے۔ امام موصوفؒ نے جس تجدید کا ارادہ کیا ہے جس احیاء کے لیے کوشش کی وہ صرف اس پر موقوف نہیں کہ دین کو بدعات، خرافات اور فضول اضافات سے پاک کر دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کامل اور ہر طرف سے مکمل تجدید ہو جو عقل جدید کے ذریعے اسلامی میراث کا شعور الہام کرے اور اس میراث کے ساتھ وہ چیزیں ملائے جو اس میراث کے مناسب ہیں اور اس کے ساتھ عصر حاضر کے علوم اور دوسری تہذیبوں کے ثمرات کو یکجا کرے تا کہ تجدید دین اور اس کے حامی علم دوست اور معاشرے سے محبت کرنے والے بن جائیں۔ اور یہ اس وقت ہی ممکن ہو گا کہ ہم نہ صرف امت مسلمہ کے سامنے بلکہ پوری دنیا کے سامنے جمود اور مغربیت کا بدل پیش کر سکیں۔

امام موصوفؒ کے افکار میں غور کرنے سے ہمیں قرآن مجید اور اس کی تفسیر جس کو امام موصوفؒ نے دینی اصلاح کے لیے استعمال کیا ہے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

☆ امام موصوفؒ نے قرآن مجید کے حقیقی اعجاز کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بنیادی طور پر یہ اعجاز لغوی نہیں ہے۔ قرآن مجید کسی فن، ادب، تاریخ یا مختلف علوم کی کتاب نہیں بلکہ یہ دین کی کتاب ہے جو مرور ایام، جگہ کے اختلاف اور لوگوں کی جنس کے تعدد کے باوجود لوگوں کو اچھے معاشرے کی تشکیل، درست راستے اور خلق عظیم کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ یہی قرآن کا حقیقی اعجاز

ہے۔قرآن مجید کسی فن کی کتاب نہیں جس میں ہر مقصد کے لیے کوئی خاص باب ہو۔ یہ کتاب ہدایت اور نصیحت ہے جو انسان کی طرف اس کی ہر حالت میں متوجہ ہوتی ہے۔اس لیے قرآن کی تفسیر کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ قرآن کو کتاب دین ہونے کی حیثیت سے سمجھا جائے کہ یہ لوگوں کو ان امور کی طرف راہنمائی کرے جن میں دنیا و آخرت کی زندگی کی خوش بختی ہے اس کتاب کا اہم مقصد بھی یہی ہے اور اس کے علاوہ تفسیر قرآن میں جو مباحث کی جاتی ہیں وہ پہلے والے مقصد کے تابع ہیں اور اسی کے حصول کے لیے وسیلہ ہیں۔

☆تفسیر قرآن میں دوسری بات جو ان کے افکار سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تفسیر قرآن میں عقل کا مرتبہ و مقام بلند ہے۔امام موصوفؒ کے نزدیک جو لوگ قرآن مجید کی روشن اور نئی تفسیر کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ سابقہ مفسرین کی تفاسیر کو ایک طرف رکھ دیں اور صرف چند باتوں سے اپنے آپ کو مزین کرلیں اور وہ چند باتیں یہ ہیں۔(i) لغت کا علم (ii) اسباب نزول سے واقفیت (iii) سیرت نبوی کا علم (iv) تاریخ انسانی کا علم اور خصوصاً ان قبائل کی تاریخ جن سے قرآن نے معارضہ کیا ہے۔ اگر یہ چند چیزیں آپ کے علم میں ہیں تو آپ قرآن مجید کی تفسیر کرسکتے ہیں۔

امام موصوفؒ نے فرمایا کہ سابقہ مفسرین کی تفاسیر کو ایک طرف رکھ دیا جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سابقہ مفسرین کی تفاسیر ان کے زمانے کی ضروریات کے مطابق تھیں اور ان کا حاصل علم وہی تھا اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری سوچ اور ان کی سوچ ایک ہو اور ہمارا حاصل علم ان کا حاصل علم ہو۔اب ازمنہ کی تبدیلی، ضروریات و احتیاجات کا بدل جانا اس بات کا مقتضی ہے کو تفسیر کو از سرنو تحریر کیا جائے جو کہ اس زمانے کی ضروریات کو پورا کرے۔

اگر ہم امام موصوفؒ کے تفسیر قرآن کے تجدیدی اسلوب کا مطالعہ کریں تو ہمیں چند ایسے اصول کا علم ہوگا جو دوسروں سے ممتاز ہیں اور یہ اصول مبادی کا درجہ رکھتے ہیں جن کے بارے میں بتانا ضروری ہے ان میں چند ایک کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

امام موصوفؒ کا تفسیر قرآن میں منہج مکمل طور پر عقلی ہے۔ جب وہ قرآن مجید میں غور و فکر کرتے ہیں تو اس حیثیت سے کہ قرآن مجید بنیادی طور پر دین کی کتاب ہے اور امام موصوفؒ ان لوگوں کے مسلک کی تردید کرتے ہیں جو قرآن مجید کو علوم و فنون کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اور امام اسی کے داعی ہیں۔امام موصوف کے نزدیک قرآن کو علوم و فنون کا مجموعہ قرار دینے میں مختلف صورتیں پیش آسکتی ہے۔مثلاً:

☆قرآنی آیات کی اس طرح تفسیر کی جائے ، وہ علمی نظریات کے مطابق بن جائیں۔

☆یا اس طرح تفسیر کی جائے گی کہ با تکلف آیات اور علمی نظریات میں ربط پیدا کیا جائے۔

☆یا اس طرح تفسیر کرنے میں بعض کے نظریات کی تصدیق ہوگی اور بعض کے نظریات کو شک کی چادر میں لپیٹ دیا جائے گا۔اور ان میں سے ہر ایک صورت عقل کو ایسی بیڑیوں اور پھندوں میں قید کردیگی جن میں کوئی فائدہ اور کوئی ضرورت نہیں ہے۔اور ایسے بھی یہ معاملہ کہ قرآنی آیات کی تفسیر بطور علمی تفسیر کرنا جس میں علمی نظریات کو ثابت کیا جائے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے منافی ہے کیونکہ اس صورت میں عقل قید ہوجائے گی حالانکہ اللہ تعالیٰ کا حکم کائنات اور اس میں موجود نشانیوں میں غور و فکر کرنے کا ہے۔اور

تفسیر قرآن کا یہ اسلوب بالکل غیر عقلی ہے اور یہ نظریہ فطرت دین اور رسالت سماویہ کو سمجھنے میں خطا سے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ خطا اس وقت ہوئی جب مقاصد روحانیہ اور عقل کے کام اور انسانی تجربات کے ثمرات کو باہم ملا دیا گیا۔ عقل انسانی اور انسانی تجربات دونوں ایسے امر ہیں کہ اسلام نے کبھی بھی ان کو قید کرنا نہیں چاہا بلکہ ان کے لیے مختلف میدان کھول دیئے ہیں تا کہ یہ اپنی مساعی کو صرف کر سکیں۔

تفسیر قرآن میں امام موصوفؒ نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ امام موصوفؒ نے ان لوگوں کا بڑی سختی سے رد کیا ہے۔ جو قرآن و دین میں علوم طبعی کے حقائق سے بحث کرتے ہیں۔ ان کے بارے امام موصوفؒ فرماتے ہیں:

> ''اگر علوم طبعی اور فلکی کو بیان کرنا نبی کا کام ہوتا تو حواس خمسہ اور عقل بے کار ہو جاتے اور انسان سے استقامت کو چھین لیا جاتا اور انسان کے ہر فرد پر ہر چیز کو من وعن تسلیم کر لینا ضروری ہوتا اور یہ بھی ضروری ہوتا کہ ہر امت میں رسولوں اور انبیاء کی تعداد اتنی ہو جو اس امت کو ان کی ضروریات کی تعلیم دے سکے چاہے ان ضروریات کا تعلق ان کے معاش سے ہو یا ان کی اخروی زندگی کے ساتھ ہو [حالانکہ ہر زمانے میں اتنی تعداد میں انبیاء ورسل نہیں آئے جو ان کی ہر قسم کی ضرورت کی تعلیم دیتے تو معلوم ہوا کہ علوم فلکی و طبعی کو بیان کرنا نبی کی ذمہ داری نہیں ہے] اور اگر تو چاہے تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ پھر ضروری ہوتا ہے کہ انسان اس نوع کا نہ ہو جس کو ہم پہنچانتے ہیں۔ جی ہاں! انبیاء لوگوں کو اجمالی طور پر متنبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے حواس اور عقل کو اس طرح استعمال کریں تا کہ ان کے منافع اور معارف میں اضافہ ہو سکے جس کے ذریعے انسانی نفوس ترقی کے منازل طے کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انبیاء ان امور پر بھی تنبیہ کرتے ہیں جن کے ذریعے ان کے ایمان میں اضافہ اور عبرت قوی ہوتی ہے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ نے ہمیں استقامت کی طرف راہنمائی کی ہے لیکن ہمارے دنیوی مسائل میں اطاعت کو لازم قرار نہیں دیا۔ جیسے کہ تابیر نخل کے واقعہ ہمیں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اپنے دینوی معاملات کو زیادہ جانتے ہو''۔ (۳) اور ایسے ہی حقیقت روح کے بارے سوال کرنا، چاند کی حالتوں کے اختلاف کے بارے سوال کرنا، قرآن مجید نے ان دونوں سوالات کو گھروں میں پچھواڑے سے آنے کے قبیل سے شمار کیا ہے''۔ (۴)

علوم طبعی و فلکی کے وسائل عقل اور تجربہ ہیں ان کو کتب دین کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کرنا گھروں میں پچھواڑے سے آنے کی طرح ہے۔ ان علوم کے حصول کے لیے درست طریقہ استعمال کریں اور وہ ہے عقل اور تجربہ۔

باقی رہی یہ بات کہ قرآن مجید میں جو کائنات سے متعلق اشارات دیئے گئے ہیں ان کا کیا مقصد ہے؟ اس کے بارے امام موصوفؒ کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید میں اشارات کونیہ کا ہونا محض عبرت اور نصیحت کے حصول کے لیے ہے ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان علوم کے حقائق ونظریات کو ثابت کیا جائے۔ جیسے برق، رعد، صاعقہ اور ان کے اسباب بتائے گئے ہیں۔ یہ قرآن مجید کے

مباحث نہیں کیونکہ ان کا تعلق علوم طبعی سے ہے۔ ایسے تمام حوادث و واقعات جن کی معرفت انسان اپنی محنت وکوشش کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ وحی پر موقوف نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں مظاہر قدرت کا بیان محض عبرت واستدلال کے لیے ہے۔ تاکہ عقل اس میں غور وفکر کر کے، ایمان کی مضبوطی کا ذریعہ بنے، قرآن ان آثار کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے تاکہ عبرت بیدار، نعمت کی یاد دہانی اور سوچ کی آمادگی ہو۔ نہ کہ قواعد فطرت کو ثابت کرتا ہے اور نہ ہی فطرت کے کسی خاص اعتقاد کو لازم کرتا ہے۔ بلکہ ان میدانوں کو عقل وتجربہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو دین، ہدایت اور متوسط انسان کے اخلاق کے لیے بنیاد بنایا ہے۔ پھر عقل انسانی کو علوم کائنات، دنیوی امور جو تفصیل طلب اور قابل تغیر ہیں ان تمام میں مرجع قرار دیا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے عقل کے ذریعے ہم کو فطرت دین، مقاصد وحی اور رسالت کی خصوصیات سے باخبر کر دیا تاکہ ہم علوم کائنات، دنیوی امور اور فطرت، مقاصد، اختصاصات کو باہم ملا نہ دیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے عقل انسانی کو ہر قسم کی قید سے آزاد کر دیا چاہے وہ قید حقیقی ہو یا فرض کر لی گئی ہو۔

امام موصوفؒ اسی سے متعلق فرماتے ہیں:

> ''رسولوں کا کام فن وحرفت کا سکھانا نہیں ہے اور نہ ہی وہ تاریخ کی تعلیم دینے کے لیے آئے ہیں۔ عالم نجوم کے مشملات کی تفصیل، اس کی حرکات کا بیان، زمین کے طبقات کی پوشیدہ چیزوں کا بیان، طول بلد وعرض بلد کی مقداروں کا بیان، نباتات کی ضروریات کا بیان، حیوانات کی بقاء کی ضروریات کا بیان اور ان تمام اشیاء کے بیان جن کے لیے مستقل علوم وضع کیے گئے ہیں۔ ان سب کی وضاحت وبیان رسولوں کا مقصد نہیں اور نہ ہی وہ اس کام کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ بلکہ ان کے لیے علیحدہ سے مستقل علوم وضع کیے گئے ہیں۔ جن کی باریکیوں کے حصول میں ذہن ایکدوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ تمام علوم و وسائل کسب سے تعلق رکھتے ہیں اور حصول راحت کے طریقے ہیں۔ انسان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ودیعت کردہ ادراک وشعور کے ذریعے ان علوم کی طرف راہنمائی کی ہے۔ یہ ادراک وشعور کے حصول کے لیے کوشش کرنے والوں کی سعادت میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اور کوتاہی کرنے والوں کو ذلیل کر دیتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے کلام میں آسمانوں اور ہیئت زمین کے اشارے محض اس لیے ہیں تاکہ وہ اس کے آسمان وزمین کے بنانے والے پر دلالت کر سکیں یا ان کے اندر موجود اسرار ورموز کے لیے فکر کو سوچنے پر آمادہ کر سکیں''۔(۵)

یہ اسلامی موقف علوم کائنات کو اس کے اصول وقوانین کے ساتھ وحی، شریعت اور دین کے بندھن سے اور عقل کو تمام بندشوں سے آزاد کرتا ہے۔ اس لیے عقل کائنات اور علوم کائنات میں غور وفکر کرتی ہے۔ مشیت ایزدی بھی یہی ہے کہ ہر چیز اپنے میدان عمل میں کام کرے دوسرے میں مداخلت نہ کرے، رکاوٹ نہ بنے اور جب انسان مشیت ایزدی کی اطاعت کرتا ہے تو انسانیت کی سعادت میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشرہ ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ اس لیے دین کو انسان اور بقدر امکان تحصیل علم کے

درمیان رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ بلکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ دین انسان کو طلب عرفان پر آمادہ کرے اور اس کو تعلیم دے کہ وہ دلیل کا احترام کرے اور انسان پر لازم کرے کہ وہ حسب وسعت کائنات کی معرفت کے حصول کے لیے کوشش کرے۔لیکن یہ بات دھیان میں رہے کہ عقائد ونظریات حدود کے مطابق رہیں۔اگر کوئی آدمی اس کے علاوہ بات کرے تو اس کو صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ دین سے لاعلم ہےاور دین پر افتراء کر رہا ہے جس کواللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائیں گے۔

آزادی عقل کا موقف جو درحقیقت اسلام کا بھی موقف ہے اس موقف کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ تمام علوم کا مرجع دلیل عقلی اور تجربہ انسانی ہے نصوص شرعیہ اور منقولات ان علوم کا مرجع نہیں ہیں۔ یہ موقف اسلام کا طرہ امتیاز ہے اور عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔اگر ہم سابقہ کتب کا مطالعہ کریں تو اس میں علوم کونیہ کی کافی تفصیلات کو بیان کیا گیا ہے۔اس میں بہت زیادہ آزمائش ہے کیونکہ اس میں بیان کردہ بہت ساری باتیں عقل وتجربہ کے معارض ہیں۔ جبکہ قرآن و اسلام کا معاملہ ان کتب کے برعکس ہے کیونکہ اسلام وقرآن تخلیق کائنات اس کی تاریخ وغیرہ کا علم عقل وتجربہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔بس اس قدر ہی ان کی تخلیق کو بیان کرتا ہے جس سے ہم اس کی حکمت وقدرت پر استدلال کیا جاسکے۔یا ہم اس کی نعمتوں کو پہچان سکیں۔آسمان وزمین کی تخلیق میں ترتیب کو بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس بات کا تعلق مقاصد دین میں سے نہیں ہے۔اگر کوئی ان حقائق سے مطلع ہونا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ کائنات میں غور وفکر کرے،ان کتب کا مطالعہ کرے جو اس سے پہلے کائنات کے بارے لکھی گئی ہیں۔یا دریافت کرنے والے سائنسدانوں کے حالات کے بارے میں واقفیت حاصل کرے۔کتاب اللہ کی ہی خوبی کافی ہے کہ اس نے انسان کو ان علوم کی طرف راہنمائی کردی اور اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔

استاد امام موصوفؒ نے اپنے تفسیری اسلوب میں عمومیت پیدا کی ہے۔ان کے نزدیک جس طرح قرآن مجید علوم کونیہ،علوم طبیعہ بیان کرنے نہیں آیا ایسے ہی قرآن مجید سابقہ امم کی تاریخ بیان کرنے نہیں آیا۔اگرچہ اس کے اندر سابقہ امم کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔لیکن اس کے باوجود یہ تاریخ کی کتاب نہیں۔امام موصوفؒ کے نزدیک کسی مفسر،کسی قاری کے لیے کسی صورت میں جائز نہیں ہے کہ وہ ان قصص کے ذریعے تاریخی حقائق وواقعات کو تلاش کرے، کیونکہ ان تاریخی قصص کو بیان کرنے کا مقصد محض عظمت کو بیان کرنا یا حصول عبرت ہے۔اسی لیے کسی بھی قصے میں ترتیب اور تفصیل کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ بلکہ قصے میں سے اسی بات کو ذکر کیا گیا ہے جس سے عبرت مقصود ہے۔قرآن مجید کسی بھی قصہ کو بطور قصہ ذکر نہیں کرتا کہ اس کی جزئیات کی تفصیل بتائے۔بعض افراد قرآنی قصص کو تاریخی کتب کے قصوں کی طرح بنا کر پیش کرتے ہیں اس کے لیے وہ مختلف روایات سے مدد لیتے ہیں صرف نظر اس بات کے وہ روایت ضعیف ہے یا موضوع ہے۔ یہ طریقہ سنت اللہ کی مخالفت ہے اور قلوب کو نصیحت سے پھیرتا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے مقصود وحکمت کو ضائع کرنا لازم آتا ہے۔قرآنی قصص کا مقصد یہ نہیں کہ آپ ان کو بطور تاریخی واقعہ کے لیں یا آپ اس واقعہ کی جزئیات پر یقین کر کے عقیدہ کا جزو بنالیں۔قرآن صرف گذشتہ اقوام کے اچھے و برے عقیدے، سچ وجھوٹ کی تقلید اور ان کی نفع مند ونقصان دہ عادت کو بیان کرتا ہے تاکہ عبرت حاصل ہو۔قرآن ان قصوں کے بیان میں اپنے مقاصد ہدایت وعبرت سے تجاوز نہیں کرتا۔انہی تک محدود رہتا ہے۔ان مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ عبارت، سیاق وسباق اور اسلوب نظم میں

ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو اچھی چیز کے حسن اور بری کے برا ہونے پر دلالت کریں اسی لیے کسی قوم کے حالات کو بیان کرنے کے لیے ایسی تعبیرات سے مدد لی جاتی ہے جو اس قوم کے ہاں مستعمل ہوں اگر چہ وہ تعبیرات درحقیقت غلط ہوں۔ جیسے قرآن مجید میں:

"کما یقوم الذی یتخبطه الشیطان من المس" (۶)

"دوسرا قول ربانی ہے۔ "بلغ مطلع الشمس" (۷)

یہ اسلوب معروف ہے۔جیسا کہ انگریزی وعربی کتب جب خصوصاً وہ مصر و یونان کے قصے بیان کرتے ہیں تو ان کتب میں مختلف خیر وشر کے معبودوں کا تذکرہ کرتے ہیں حالانکہ مصنفین ان بت پرستانہ خیالات کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ہم سورج کے غروب ہونے کو ان الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں کہ سورج مغرب میں ڈوب گیا حالانکہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں کیونکہ سورج کبھی ڈوبتا نہیں بلکہ وہ کسی دوسرے علاقے میں نظر آ رہا ہوتا ہے۔اور ساحل کے قریب رہنے والے افراد غروب آفتاب کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ سورج پانی میں ڈوب گیا حالانکہ ان کا اعتقاد یہ نہیں ہے بلکہ وہ تو صرف نظر آنے والی چیز کو اپنے لفظوں سے تعبیر کر رہے ہیں۔

امام موصوفؒ کے نزدیک، قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دینی نصوص میں جو اشارات کائنات، اس کے علوم کے بارے میں ہیں یا جو قصے مختلف اقوام کے بیان کیے گئے ہیں ان کا مقصد نہ تو علمی حقائق کو ثابت کرنا ہے اور نہ ہی تاریخی واقعات کو ثابت کرنا ہے۔ بلکہ ایسا خاص دینی تصور پیش کرنا بھی مقصود نہیں جس پر ان علوم کے حقائق اور نظریات کی بنیاد رکھی جائے۔ بلکہ یہ واجب ہے کہ ان تمام علوم میں عقل اور تجربہ کو ہی مرجع بنایا جائے یہی اسلام اور قرآن کا مدعا ہے۔ان حقائق کو دیکھتے ہوئے مفسرین پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے علمی وتاریخی اشارات کو اس انداز سے بیان نہ کریں جس سے عقل سلیم ایسی زنجیروں میں جکڑی جائے جو کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو عقل کو تدبر، غور وفکر کے لیے آزاد چھوڑتے ہیں۔

☆امام موصوفؒ نے تفسیر قرآن مجید جو موقف اختیار کیا ہے یہ متکلمین فلاسفہ کے بہت قریب ہے۔خصوصاً معتزلہ کے بہت قریب ہے جن کے ہاں بھی عقل کا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ یہ حضرات اور امام موصوفؒ ان تمام نتائج جن تک انسانی عقل رسائی حاصل کرتا ہے کو ذات باری تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ قرار دیتے ہیں۔اس کو بالفاظ دیگر یوں بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ عقل کا راستہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ ہے کیونکہ عقل انجام کار اللہ تعالیٰ تک پہنچا دے گی۔

امام موصوفؒ کے نزدیک، اسلام ایک عقلی مذہب ہے یعنی عقل اس کے دینی اور دینوی اطراف میں حاکم اور سردار ہے۔ امام موصوفؒ نے اس حقیقت پر بہت زیادہ دلائل دیئے ہیں۔لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ امت مسلمہ اس حقیقت کے بارے مختلف طبقات میں تقسیم ہوگئی۔بعض افراد امت نے اس موقف کو سختی سے رد کر دیا۔بعض اس حقیقت کے بارے تذبذب کا شکار ہو گئے یعنی تسلیم کرنا بھی چاہتے ہیں اور کرتے بھی نہیں ان میں سے تیسرا طبقہ وہ ہے جو اس موقف اور حقیقت کو سننے سے بھی ڈرتا ہے۔اور وہ ڈر یہ ہے کہ اگر ہم نے اس کو سن لیا تو کہیں عقل اس کو تسلیم نہ کر لے اور ہم دائرہ ایمان سے نکل جائیں۔جیسا کہ کفار مکہ نے کہا تھا:

لاتسمعوا لهذا القرآن و الغوافيه لعلكم تغلبون (۸)

یہ حقیقت کسی صورت میں جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ اسلام نے عقل کو میزان عادل قرار دیا ہے جس کے ذریعے تصورات اور مشاہدات کو تولا جاتا ہے۔ اور تصورات و تصدیقات کی انواع میں تمیز کی جاتی ہے۔ جب حقائق کا پلڑا جھک جائے گا تو خود بخود اوھام کا پلڑا اڑنے لگے گا۔

اگر ہم احادیث نبوی ﷺ میں غور کریں تو یہ بات کہ عقل میزان عدل ہے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ہم چند ایسی احادیث کا تذکرہ کریں گے جن سے معلوم ہو جائے گا کہ عقل دینی و دنیوی معاملات میں میزان عدل ہے اور امام موصوفؒ کے نظریہ کی تائید بھی ہو جائے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ امام موصوفؒ کا یہ عمل ایک تجدیدی کارنامہ ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے عقل کے استعمال پر قدغن لگا دی گئی تھی اور اس کو صرف دنیوی کاموں تک محدود کر دیا گیا اور دینی معاملات میں عقل کے استعمال کو الحاد و زندقہ شمار کیا جا رہا تھا۔

i) غزوہ خندق کے بعد حضور علیہ السلام کو بنو قریظہ کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس موقع پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ کے احاطہ میں۔ اس حکم کے ملنے کے بعد بعض صحابہؓ نے وقت کی تنگی کی وجہ سے راستے میں نماز پڑھ لی کیونکہ عقل کے مطابق حکم کا مقصود جلدی پہنچنا ہے۔ نہ یہ کہ نماز کو ہی قضا کر دیا جائے اور بعض نے نہیں پڑھی۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے نماز پڑھنے والوں کو کوئی ملامت نہیں کی ان کے استعمال عقل کو درست قرار دیا۔ (۹)

ii) حدیث پاک میں ہے کہ ایک عورت نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ میری والدہ نے منت مانی تھی حج کرنے کی لیکن ان کا انتقال ہو گیا ہے کیا میں ان کی طرف سے حج ادا کر سکتی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تیرا کیا خیال ہے کہ اگر اس پر قرض ہوتا تو اس کو ادا کر دیتی؟ اس عورت نے کہا بے شک میں ادا کر دیتی۔ حج بھی قرض ہے۔ لہٰذا اس کو بھی ادا کر۔ اس حدیث میں بھی استعمال عقل کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور اس کو دینی مسئلہ میں معتبر قرار دیا گیا ہے۔ (۱۰)

iii) حضرت عمرو بن العاصؓ کو دوران سفر غسل کی حاجت تھی لیکن سخت سردی کی وجہ سے تیمّم کر کے نماز پڑھا دی جس پر بعض نے اعتراض کیا۔ (۱۱) جب یہ خبر حضور علیہ السلام تک پہنچی تو حضرت عمرو نے اپنا عذر بیان کر دیا کیونکہ اس معاملہ میں عقل کو استعمال کیا کہ سخت سردی کی بناء پر غسل کرنا ہلاکت میں ڈال سکتا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے ان کی کوئی گرفت نہ کی جو کہ استعمال عقل کے جواز پر دلالت کرتی ہے ان احادیث کے علاوہ بھی بہت ساری احادیث ہیں جن سے عقل کا میزان عدل ہونا معلوم ہوتا ہے۔

عقل دینی اور دنیوی دونوں قسم کے امور میں معیار اور کسوٹی ہے جس کے ذریعے ان امور کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس کی بہت بڑی دلیل عقائد اسلام ہیں۔ اسلام کے بنیادی دو عقائد ہیں: (الف) الوہیت (ب) رسالت محمدی ﷺ ان دونوں کی تصدیق عقل پر موقوف ہے۔

امام موصوفؒ کے نزدیک یہ دونوں عقائد عقل پر موقوف ہیں ان کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ پہلے عقیدے یعنی اللہ تعالیٰ کی تصدیق اور اس کی توحید کی تصدیق میں اسلام عقلی دلیل کے سوا کسی دلیل پر اعتماد نہیں کرتا۔ سوائے چند لوگوں کے جن کی رائے

معتبر نہیں تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ نبوت کے اعتقاد سے پہلے اللہ تعالیٰ کا اعتقاد ضروری ہے کیونکہ رسولوں پر ایمان لا نا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد ہی ممکن ہے۔ رسولوں کے کلام اور کتب سماویہ سے ایمان باللہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ عقلاً محال ہے کہ آپ وجود الہ کی تصدیق سے پہلے اس کی کتاب پر ایمان لائیں۔

اہل علم کے نزدیک مکلّف پر سب سے پہلے جو چیز واجب ہوتی ہے وہ اعتقاد باللہ کے حصول کے لیے غور وفکر کرنا ہے ایمان باللہ سے انسان ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب تک پہنچتا ہے۔

اسلام کی دوسری دعوت رسالت محمدی ﷺ کی تصدیق ہے۔ اس میں بھی اسلام خرق عادت فعل کے ذریعے دلیل دیتا ہے۔ اور خبر متواتر کے مطابق قرآن مجید ہی وہ خرق عادت چیز ہے۔ قرآن مجید لوگوں کو ان کی عقول کے ذریعے اپنے اندر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے بارے امام موصوفؒ کے الفاظ ہیں:

> ''قرآن مجید ایسا معجزہ ہے۔ جس کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے اور غور کرنے والا اس کو پہچان لے گا۔ قرآن مجید میں غور وفکر کو روا رکھا گیا ہے۔ اور اس کے مضامین کو پھیلانے کا حکم دیا گیا ہے قرآن مجید میں عقل کا وافر حصہ ہے جو کم نہیں ہوسکتا۔'' (۱۲)

یہی وہ موقف ہے جو اسلام کو باقی ادیان سے ممتاز کرتا ہے اور اس کی تہذیب وثقافت کو دوسری تہذیبوں سے جدا کر دیتا ہے۔ دوسرے ادیان میں دین وعقل میں منافات ہے جو دور نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ اسلام میں دوسرے ادیان کے مقابلے میں عقل و دین میں اتصال اور چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حتیٰ کہ اسلام عقل کو کائنات اور اصول دین میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اہل کتاب اپنے عمل اور قول سے اس بات پر متفق ہیں کہ عقل و دین ایک دوسرے کی ضد ہیں یہ اکٹھے نہیں ہوسکتے اور ایک دوسرے کے مخالف ہیں کہ کبھی ان میں اتفاق نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی وہ تمام نظریات جو عقل کا نتیجہ ہیں اور نصوص سے ثابت نہیں۔ یہ اہل کتاب کے ہاں باطل ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران آپ کو جابجا غور وفکر کی دعوت ملے گی اور اس کے اسرار ورموز کو تلاش کرنے کا حکم ملے گا۔ چند آیات کا تذکرہ ہم یہاں کیے دیتے ہیں۔:

قل انظروا ماذا فی السموات والارض (۱۳)

افلم یسیروا فی الارض فتکون لهم قلوب یعقلون بها (۱۴)

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت (۱۵)

قل سیروافی الارض فانظروا کیف بدألخلق (۱۶)

اس کے علاوہ اور بہت ساری آیات ہیں۔ قرآن مجید میں کسی چیز کا کثرت سے ذکر اس کے اہم اور باعظمت ہونے کی دلیل ہے۔ تخلیقات میں غور وفکر پر آمادہ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسان بقدر وسعت کائنات کے اسرار ورموز سے واقف ہوکر ایسے علوم وضع کرسکے جس سے انسانی معاشرہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھ سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اس تقلید فاسد کا معارضہ کیا گیا ہے جس پر اہل کتاب اڑے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ ان اشیاء سے منتفع نہیں ہوسکے جن سے انتفاع کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اگر

مسلمان عقل کے بارے میں اسلام کے نظریہ کو پہچان لے اور تمام دینی و دنیاوی امور کو اس کے ذریعے پرکھے تو وہ دنیا میں ممتاز مقام حاصل کر سکتا ہے اور اس کی تہذیب بھی دوسری تہذیبوں سے ممتاز ہو جائے گی۔ اور یہی اسلام کا موقف و مقصد ہے کہ مسلمان اور مسلم تہذیب کو دوسروں سے ممتاز مقام و مرتبہ حاصل ہو۔

امام موصوفؒ نصوص منقولہ کے بارے تقسیم کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک نصوص کی دو اقسام ہیں: (i) جو نصوص قرآن مجید میں منقول ہیں (ii) دوسری نصوص جو قرآن مجید کے علاوہ ہیں یعنی احادیث۔ دوسری قسم کی نصوص سے متعلق امام موصوفؒ کی رائے ہے کہ ان کا مرتبہ عقل سے زیادہ نہیں کیونکہ وہ نصوص جن راوۃ ورجال کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں ہمیں ان کے بارے کوئی معلومات نہیں اور نہ ہی ہم ان مروی نصوص کو ایسی دلیل قرار دے سکتے ہیں۔ جس کا مرتبہ عقل سے زیادہ ہو۔ کیونکہ عقل انسانی قویٰ میں سے مطلقاً افضل ہے۔ ان نصوص کی حیثیت کے بارے امام موصوفؒ ایک ہندوستانی عالم سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایسی سند کی کیا قیمت ہو سکتی ہے جس کے رجال، ان کے احوال اور ثقافت وضبط میں ان کے مرتبہ سے میں واقف نہیں ہوں۔ یہ تو محض نام ہیں جن کو مشائخ نے اوصاف کے ذریعے قبول کر لیا ہے اور ہم ان کی اس میں تقلید کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پاس ان کے بارے گفتگو کرنے کا کوئی راستہ نہیں''۔ (۱۷)

اس باب میں جس میں اکثر اخبار آحاد داخل ہیں اور یہی احادیث سب سے زیادہ ہیں یعنی اخبار آحاد کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ امام موصوفؒ اس باب میں راوی کی ثقاہت پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ کثرت کا مطالبہ کرتے ہیں جو ثقاہت کو مضبوط کر سکے۔ کیونکہ امام موصوفؒ کے نزدیک جب راوی کسی روایت کو نقل کرتا ہے تو وہ ایک خاص حالت میں ہوتا ہے اور کسی کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ راوی کی اس خاص حالت سے واقف ہو سکے۔ یہاں تک کہ وہی حالت اس غیر کے لیے بھی پیدا ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ اس راوی کے احوال اخلاق، ذاتیات وغیرہ سے واقف ہو ہر راوی کے بارے ان تمام باتوں سے واقف ہونا امر محال ہے۔ لہٰذا اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ ہم ان نصوص کو قرآن مجید پر پیش کریں۔ اگر وہ نص قرآن مجید کے موافق ہے تو قابل اعتماد حجت ہے اور اگر قرآن مجید کے مخالف ہے تو اس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ اگر وہ نص ان دونوں حالتوں سے باہر ہے یعنی وہ نص قرآن کے موافق ہے نہ مخالف۔ اس صورت میں اس کو عقل پر پیش کیا جائے گا۔

جیسا کہ عقائد و توحید کے معاملات اخبار آحاد سے ثابت نہیں کیے جا سکتے اگرچہ وہ آخبار آحاد صحیح کیوں نہ ہوں کیونکہ اخبار آحاد کا دائرہ کار عملیات تک محدود ہے۔ عقائد اس کے دائرہ کار سے خارج ہیں۔

قرآنی نصوص کے متعلق امام موصوفؒ کا موقف بالکل واضح ہے۔ ان نصوص میں وہ کسی قسم کے شک و شبہ کے اندر مبتلا نہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کے بارے ایسا موقف قائم کیا ہے جس کو اختیار کرنے سے انسان اپنی عقل کے ذریعے قرآن مجید سے راہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ موقف یہ ہے کہ قرآن مجید سب سے پہلے دین کی کتاب ہے۔ اگر اس میں کہیں کائنات یا طبیعت کے متعلق گفتگو کی گئی ہے تو وہ محض نصیحت اور عبرت کے لیے ہے۔ قواعد علمیہ کو ثابت کرنا یا کسی فطرت کے بارے خاص اعتقاد کو لازم کرنا مقصد نہیں ہے۔

امام موصوفؒ نے قرآنی آیت جس میں تخلیق آدمؑ کا تذکرہ ہے کے بارے فرمایا ہے کہ بعض لوگوں نے اس آیت کی تکذیب کی ہے کیونکہ ان کے علم کے مطابق تخلیق انسان ایسے نہیں ہوئی۔لیکن ان کا آیت کی تکذیب کرنا درست نہیں کیونکہ آیت کا مقصد تخلیق انسان کی ابتداء بیان کرنا نہیں بلکہ اس کے الٰہی مقاصد ہیں ہدایت، نصیحت اور عبرت وغیرہ۔تاکہ انسان کے اندر موجود قوت خیر اور قوت عاقلہ متحرک ہو اور اپنی مادی و حقیقی سعادت کو حاصل کر سکے۔

اگر امام موصوفؒ کے موقف پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امام نے نصف موقف سلفیوں سے اور نصف موقف فلاسفہ سے لیا ہے۔گویا کہ ان کا موقف ''سلفی فلسفی'' کا ہے۔نہ تو انہوں نے بالکل سلیفوں کا موقف اختیار کیا کہ جنہوں نے سابقہ لوگوں سے منقول نصوص کو اس قدر اہمیت دی کہ ان کو عقل سے بڑھا دیا اور عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر رطب و یابس کو قبول کر لیا۔اور نہ ہی بالکل فلاسفہ کے موقف کو اختیار کیا ہے۔کہ جنہوں نے صرف عقل کے راستے کو اختیار کیا اور بغیر فرق کیے تمام نصوص کو رد کر دیا بلکہ انہوں نے نصوص کو تقسیم کیا ہے کہ بعض نصوص متواتر ہیں جن میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔جیسے قرآن مجید۔اور بعض نصوص ایسی ہیں جو رواۃ کے واسطہ سے پہنچی ہیں لہٰذا ان کی اسناد کے تحقق کو معلوم کرنا ہمارے بس میں نہیں۔

اگر ہم دین اسلام کو اس طرح سمجھنا چاہتے ہیں جو ابتداء میں نازل ہوا تھا۔جو قرون اولیٰ کے زمانے میں تھا جس میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا تھا تو ہمیں امام موصوفؒ کے سنہری اقوال کو سمجھنا پڑیگا۔قرون اولیٰ میں بھی اسلام کو سمجھنے کا یہی طریقہ تھا۔

حوالہ جات

۱۔رضا، رشید، سید، مجلّہ ''المنار'' مطبعہ المنار، مصر، ۱۹۲۸ء جلد ۸، ص ۸۸۱

۲۔ایضاً، ص ۸۸۱

۳) محمد عمارہ، ڈاکٹر ''الاعمال الکاملہ لامام محمد عبدہ'' دارالشروق، بیروت ۱۹۹۳ء، جلد ۳، ص ۲۳۱

۴۔طحاوی، احمد بن محمد بن سلامہ، ابوجعفر، ''شرح مشکل الاثار''، مؤسۃ الرسالۃ بیروت ۱۴۱۵ھ، حدیث ۱۷۲۰، جلد ۴، ص ۴۲۳

۵۔مجلّہ ''المنار''، جلد ۱، ص ۲۸۶

۶۔بقرہ: ۱۔۲۷۵ ۷۔کہف: ۱۸۔۹۰ ۸۔حم سجدہ: ۱۴۔۲۶

۹۔بخاری، محمد بن اسماعیل، ابوعبداللہ، ''الجامع الصحیح بخاری'' قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی، ۱۹۵۶، جلد ۲، ص ۱۵

۱۰۔ایضاً، جلد ۳، ص ۱۸

۱۱۔احمد امام، مسند احمد، موسستہ الرسالہ بیروت ۲۰۰۱ء، جلد ۲۹، ص ۳۴۶

۱۲۔مجلّہ ''المنار''، جلد ۵، ص ۴۴۱ ۱۳۔یونس، ۱۰: ۱۰۱

۱۴۔حج، ۲۲: ۴۶ ۱۵۔غاشیہ، ۸۸: ۱۷ ۱۶۔عنکبوت، ۲۹: ۲۰

۱۷۔''الاعمال الکاملہ لامام محمد عبدہ''، جلد ۳، ص ۱۹۸